

ادیب اعظم مولانا سید محمد باقر شمس

جناب حسین انجم صاحب، پاکستان

تعارف شخصیت

خاندان: لکھنؤ کا ایک علمی گھرانہ 'خاندان اجتہاد' کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے مورث اعلیٰ حضرت غفر آئمہ تھے۔ جناب عزیز لکھنوی نے ان کا اور ان کے خاندان کا تعارف دو شعروں میں اس طرح کیا ہے:

غفران مآب، حجت حق، آیہ الہ

مہر شرف، مجدد اسلام، دیں پناہ

تاہاں ہیں ان کی نسل میں ایسے نجوم بھی

کرتے ہیں اکتساب ضیاء جن سے مہر و ماہ

اسی خاندان کے فرزند رشید مولانا محمد باقر شمس ہیں۔

جن کے تعارف میں جناب شاداں دہلوی نے یہ دو شعر کہے ہیں جو کافی ہیں:

یہ ہیں فخر خاندان حضرت غفران مآب

علم دیں ہے مستقل توقیر باقر شمس کی

ناز کر سکتا ہے جس پر خاندان اجتہاد

وہ ہے، شاداں! جرات تحریر باقر شمس کی

نسب: اسی خاندان کی عدیم المرتبت شخصیت علم العلماء مولانا سبط حسین صاحب مجتہد تھے۔ جنہوں نے لکھنؤ میں تحصیل علم کر کے عراق کا سفر کیا۔ وہاں درس خارج کے دو دورے تمام کر کے خود درس خارج دینا شروع کیا۔ اس کی شہرت ہندوستان تک پہنچی۔ کیونکہ یہ ایسی منزلت تھی جو ہندوستان کے کسی عالم کو نصیب نہیں ہوئی۔ جو عالم یہاں سے گیا وہ طلبہ کی

صف میں بیٹھ کے چلا آیا۔ ان کی شادی مولانا ابوالحسن عرف بچھن کی صاحبزادی سے ہوئی۔ مولانا ابوالحسن صاحب کو واد علی شاہ نے ملاذ العلماء اور ملکہ وکٹوریہ نے شمس العلماء کا خطاب دیا۔ عدالت دیوانی کی حاضری سے مستثنیٰ کیا۔ اور دربار میں بانیسویں نمبر کی کرسی دی۔ وہ اپنے وقت کے منطق میں ارسطو سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے ہندوستان میں معقولات کا درس خارج دینا شروع کیا جو پہلی اور آخری خصوصیت تھی۔ منطق میں ان کی کتاب "تنفیذ النقود فی حل مغالطۃ عامۃ الورود" معرکہ آرا کتاب ہے۔ ان کے بعد ہندوستان کی خاک سے منطق میں کوئی صاحب تصنیف پیدا نہیں ہوا۔ ان کا تقدس اور سخاوت بھی مشہور تھی۔ ان کے بعد کے دور کے تمام علماء اور اطباء ان کے شاگرد تھے۔ سارا ہندوستان ان کا مقلد تھا۔ اپنے دور میں مرجع تقلید تھے۔ ۱۳۰۹ھ میں چالیس برس کے سن میں ان کا انتقال ہو گیا۔ سارے ہندوستان نے ان کا سوگ منایا مولانا شمس اسی قرآن السعدین کی یادگار ہیں۔

ولادت: مولانا کی ولادت ۱۰ اگست ۱۹۰۹ء مطابق ۲۳ رجب ۱۳۲۷ء منگل کے دن اول نماز صبح کے وقت جو پور میں ہوئی جب اذان کی آواز سے فضا گونج رہی تھی۔

میر مصطفیٰ حسین صاحب جو پوری نے قطعہ تاریخ کہا

مولود نو مبارک آقا ئے دیں پناہ !

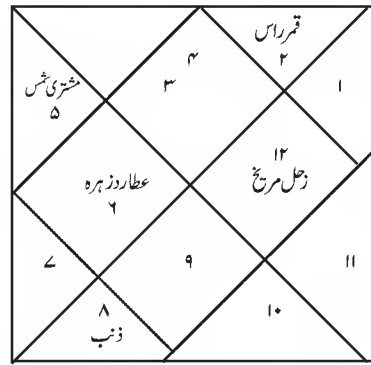
اجداد کی طرح سے ہو یا رب! یہ انتخاب

تاریخ مصطفیٰ نے کہی از سر ادب

نکلا فلک پہ علم کے اک تازہ آفتاب

بہ تعمیم الف: ۱۳۲ھ

مولانا کے ایک دوست نے ان کا حسب ذیل زائچہ بنایا
مولانا سید محمد باقر شمس: اپنے زائچہ کی روشنی میں



جوگ

موصوف کے زائچہ میں شمس اور عطارد اوج کے ہیں اور قمر برج شرف میں ہے۔ اس جوگ کے حامل صاحب زائچہ کو مشہور زمانہ ہونا چاہیے۔ لیکن اتفاق سے قمر کا برج شرف زائچہ کے بارہویں خانہ میں پڑا ہے جو خس ہے۔ اس بنا پر مولانا کو وہ شہرت حاصل نہ ہو سکی جو ہونا چاہیے تھی۔ زائچہ کا پانچواں خانہ جو علم سے متعلق ہے اس کا مالک زہرہ ہے اور زہرہ وبال میں ہے۔ اس کمزوری کے سبب موصوف اپنے والد کی طرح مجتہد نہیں بن سکے۔ اور تعلیمی سلسلہ ایک حد تک جا کر رک گیا اور مزید آگے نہ بڑھ سکا۔ زہرہ کا تعلق حسن و عشق سے ہے۔ لہذا مولانا کو شعر و ادب سے بہت لگاؤ ہے۔ طالع کا مالک عطارد اوج میں ہے، کیندر میں پڑا ہے اس بنا پر موصوف کی عمر بانوے سال ہوتی ہے۔

تعلیم: ابتدائی کتابیں مولوی علی سعید صاحب سے پڑھیں۔ ان کے بعد اپنے والد سے تحصیل علم کی۔ طب بھی انہی سے پڑھی۔ منبع الطب کا لکھنؤ سے طب کا اور لکھنؤ یونیورسٹی سے دیر کامل کا امتحان پاس کیا۔ شیخ ممتاز حسین (مدیر اودھ پنچ) سے عبرانی پڑھنا شروع کی تھی کہ راجہ ہرپال سنگھ ہائی اسکول، سنگرامو، ضلع جونپور میں اردو اور فارسی کے معلم کی حیثیت سے تقرر ہو گیا۔ وہاں انگریزی اور ہندی پڑھی۔ وہ عربی فارسی اور ہندی پر کامل عبور رکھتے ہیں۔ اردو ان کی مادری زبان ہے۔ انگریزی بہت کم جانتے ہیں اور عبرانی نہ جاننے کے برابر ہے۔

سیرت و کردار

حقیقت میں انسان کی سیرت و کردار اس کی فطری جبلی عادتوں کا نام ہے۔ مولانا بھی فطرت کے اس قانون سے مستثنیٰ نہیں۔ ان کے مزاج میں سختی بہت ہے۔ یوں تو وہ ہر آنے والے سے بڑی سادگی اور بے تکلفی سے گھل مل کر بات کرتے ہیں مگر بلند آواز اور پر زور الفاظ میں۔ یہ گرم جوشی ان کی سختی مزاج کا نتیجہ ہے اور تحریر میں بھی ان کا یہی انداز ہے۔ جس کو لوگ لہجہ کی تلخی سے تعبیر کرتے ہیں۔

راستبازی: وہ کبھی خلاف حقیقت بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس کا ایک واقعہ بھی ہے۔ ان کا ایک مضمون میر انیس کے متعلق ”طلوع افکار“ میں شائع ہوا۔ عبدالرؤف عروج نے وہ مضمون ”حریت“ میں شائع کر دیا۔ میں نے نوٹ لکھا کہ طلوع افکار کا مضمون بغیر اس کے حوالہ کے ”حریت“ میں شائع ہوا ہے جو ادارتی دیانت کے خلاف ہے۔ ایڈیٹر نے عروج صاحب سے باز پرس کی۔ وہ مولانا کے پاس آئے اور ان سے کہا۔ یہ لکھ دیجئے کہ میں نے یہ مضمون عروج کو لکھ کر دیا تھا۔ مولانا نے کہا: ”یہ بات واقعہ کے خلاف ہے۔ میں یہ نہیں لکھ سکتا۔“ اس پر وہ

ناراض ہو گئے اور صاحب سلامت اور آمد و رفت ختم کر دی۔

حق پسندی: مولانا میں اس شدت سے حق پسندی پائی جاتی ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے سامنے غلط بات کہتا ہے تو وہ فوراً اس کی رد کریتے ہیں۔ اس میں وہ چھوٹے اور بڑے کا بھی امتیاز نہیں کرتے۔ ان کے بزرگوں نے انہیں تنبیہ بھی کی کہ برابر والوں سے ایسا برتاؤ تو ایک حد تک درست ہو سکتا ہے، لیکن بزرگوں کی بات کو اس طرح رد کر دینا بدتہذیبی و گستاخی ہے۔ ان کی غلط بات کو نہ کر صاحبانِ خرد خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کو عقلاً نے ”خطائے بزرگاں گرفتن خطاست“ کہا ہے۔ مگر مولانا اپنی فطرت سے مجبور ہیں۔ اور وہ بزرگوں کی نصیحت پر عمل نہیں کر سکے۔

جذبہ انتقام: ان میں جذبہ انتقام بھی بہت ہے۔ عفو و درگزر ان کے مزاج میں نہیں ہے۔

تعقل: وہ ہر بات عقل کی ترازو میں تولتے ہیں اور خلاف عقل بات کسی طرح کی بھی ہو وہ ہرگز قبول نہیں کرتے۔ انسانی ہمدردی: ان کے دل میں انسانی ہمدردی بھی کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی غرض ان سے بیان کرتا ہے تو وہ اسے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انہیں معلوم ہوا کہ فلاں شخص کو یہ تکلیف ہے اور وہ اسے دور کر سکتے ہیں تو وہ بغیر اس کی خواہش کے اس کی مدد کرتے ہیں۔

حسن پرستی: وہ حسن پرست بھی بلا کے واقع ہوئے ہیں۔ ہر حسین چیز ان کے دل پر بے انتہا اثر کرتی ہے۔ اسی وجہ سے وہ ادب و شعر کے دلدادہ ہیں۔ اور خاص طور پر وہ اشعار جن میں تغزل ہوتا ہے ان کے دل پر بہت اثر کرتے ہیں۔ مگر عورت کے معاملے میں وہ عیاش نہیں

ہیں۔ تعداد و دواج تک کو ناپسند کرتے ہیں۔

اپنی ذات سے بے اعتنائی: انہوں نے کبھی اپنے کو نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی۔

زمانہ کی ناقدری کی شکایت: انھوں نے کبھی زمانہ کی ناقدری کی شکایت نہیں کی۔ ان کا کہنا ہے کہ زمانہ بڑا قدرداں ہے۔ جو لوگ زمانہ کی ناقدری کی شکایت کرتے ہیں وہ خود غلط ہیں۔ ہر شخص کی قدر اس کے حالات سے متعلق ہوتی ہے۔

وعدہ کی پابندی: مولانا وعدہ کے بھی سختی سے پابند ہیں۔ جب وعدہ کسی سے کر لیتے ہیں تو چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے اسے ایفا کر کے رہتے ہیں۔

داد و دہش: وہ اپنی آمدنی کا زیادہ حصہ داد و دہش میں صرف کر دیتے ہیں۔

حقیقت پسندی: یہ بھی ان میں سختی سے پائی جاتی ہے۔ ابتدائی عمر میں انہوں نے شعر کہنا شروع کیا اور زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے اشعار میں نہ تخیل کی بلندی ہے نہ طرز و ادا میں کوئی جدت و ندرت ہے۔ پامال مضامین سیدھے سادے طریقے سے نظم کرتے ہیں۔ یہ بیجان شاعری ہے۔ خدا نے مجھے شاعر نہیں پیدا کیا ہے۔ شعر کہنا وقت ضائع کرنا ہے اور انہوں نے شعر کہنا چھوڑ دیا۔ اس بارے میں بعض اساتذہ سے دلچسپ گفتگو بھی ہوئی۔

مرزا جعفر علی خاں اثر نے ان سے ایک دن کہا: آپ اپنے دل میں کہتے ہوں گے کہ جب بھی میں آتا ہوں تو یہ اپنے اشعار سناتے ہیں۔ آج میں آپ کے اشعار سنوں گا۔

کہا: میں نے شعر کہنا چھوڑ دیا۔

پوچھا: کیوں؟ ان سے وہی وجہ بیان کی۔

اس سے طبیعت میں روانی اور نرمی پیدا ہوتی ہے۔ اسے کام میں نہ لانا، کفرانِ نعمت ہے۔ مگر مولانا اپنے فیصلہ پر قائم رہے۔ اور اب وہ گھر میں کسی تقریب کے موقع پر کوئی نظم یا قطعہ تاریخ کہہ دیتے ہیں۔ حالانکہ ان کی ابتدائی عمر کے کلام میں بہت بلند پایہ اشعار بھی ہیں۔ مثلاً:

نظر لگنے کا ان کے واسطے گنڈا بنانے کو
بچار کھے ہیں میں نے تار کچھ اپنے گریباں میں
اچھوتی تخیل ہے اور موثر الفاظ میں ادا ہوئی ہے۔
آئے عدم سے گلشن ہستی کی سیر کو
دامن الٰہ گیا ہے یہاں خازرا میں

اس طرح کے بہت اشعار میں نے ان کے انتخاب کلام میں لکھ دئے ہیں۔ اگر مولانا مشقِ سخن جاری رکھتے تو ایسے بہت سے اشعار ان کے دیوان میں ہوتے۔ حال میں انہوں نے منقبت کہی ہے۔ وہ کسی بڑے سے بڑے شاعر سے کم درجہ کی نہیں ہے۔ اس لئے مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ مولانا کا شعر گوئی کو ترک کرنے کا فیصلہ صحیح نہیں ہے۔

فن

جناب محترم مولانا سید محمد باقر صاحب شمس مدظلہ باعتبار عمر اگلے وقتوں کے ہیں۔ مگر باعتبار فکر و نظر دور جدید کے تقاضوں سے پوری طرح باخبر ہیں۔ اور اس کی ہر اچھی بات کو سراہتے ہیں، اگرچہ خامیوں کی سختی سے گرفت کرتے ہیں۔ یہی ایک باشعور اہل علم اور نقاد کا فرض ہوتا ہے۔ ان کی شخصیت ہمہ جہت ہے۔ وہ ایک عالم دین بھی ہیں اور ایک ایسے وسیع النظر اور روشن خیال مفکر بھی جو مثلاً نہ صرف موسیقی جیسی بادی النظر میں غیر شرعی چیز کے مختلف پہلوؤں سے باخبر ہیں بلکہ اس کو بشرط و شروط غذائے روح بھی سمجھتے ہیں۔ وہ شاعر بھی ہیں

انہوں نے کہا: شاعری کی ساری چہل پہل چھٹ بھٹیوں کے دم سے ہے۔ اساتذہ گے ہیں اور مشاعروں میں کہاں جاتے ہیں۔ کوئی بڑا مشاعرہ ہوا اور صدارت کے لئے کسی سے کہا گیا تو وہ چلا گیا۔ چھٹ بھٹیوں سے ہی مشاعروں میں رونق ہے۔

پوچھا: اگر سب یہی سمجھ لیں تو دنیائے شاعری میں سناٹا چھا جائے۔ کہا۔ جب میں میر و سودا کے برابر کرسی بچھا کر نہیں بیٹھ سکتا تو چھٹ بھٹیوں کے ساتھ چٹائی پر بیٹھنا مجھے منظور نہیں ہے۔

محشر صاحب سے بھی اسی طرح کی گفتگو ہوئی۔ انہوں نے فرمایا۔ دل کے بہلانے کو یہ شغل بہت اچھا ہے۔ کہا: زمیں اور بھی آسماں اور بھی ہیں

عزیز صاحب نے پوچھا: ”آپ کس سے اصلاح لیتے ہیں“۔ کہا: ”میں نے تو شعر کہنا ہی چھوڑ دیا“۔ پوچھا: ”کیوں؟“۔ ان سے بھی وہی وجہ بیان کی۔ انہوں نے کہا ”شاعر کسی درجہ کا بھی ہو، اپنے معمولی شعر کو بھی اچھا سمجھتا ہے۔ اس سے طبیعت میں انبساط اور دل میں گداز پیدا ہوتا ہے۔ اس سے اس کے اخلاق پر اثر پڑتا ہے۔ شعرا اپنے لئے کہنا چاہئے۔ اسی کو میں نے ایک شعر میں یوں نظم کیا ہے۔

نہ ان کے لئے اور نہ ان کے لئے
کہ میں شعر کہتا ہوں اپنے لئے
کہا:

میں دوسروں کے بہترین شعر پڑھ کر اپنے میں وہی کیفیتیں پیدا کر لیتا ہوں۔

فرمایا۔ نہیں! موزونیت طبع ایک خداداد نعمت ہے۔

وہ عہد موجود کی مستند ترین ہستی ہیں۔ ’لکھنؤ کی زبان‘ کے نام سے انہوں نے ایک نہایت دقیق کتاب لکھی جو نہ صرف زبان دانی پر سند ہے بلکہ اس موضوع پر علامہ آرزو لکھنوی کی کتاب ’’نظام اردو‘‘ کے دوش بدوش وہ سب سے اہم تصنیف ہے۔ تحقیق کے میدان میں بھی انہوں نے کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں۔ تاریخ کی تحقیق کے سلسلے میں ’’تاریخ لکھنؤ‘‘ اور ’’اسلام پر کیا گزری‘‘ کا ذکر آچکا ہے۔ اسی ذیل میں اسلامی تاریخ کے حوالے سے امام ابوحنیفہؒ کے مسلک پران کی تحقیق، لکھنؤ کی شاعری، لکھنؤ کی تہذیب وغیرہ کے موضوعات پران کی تصانیف ان کی تحقیق و تدقیق اور تلاش و جستجو کی آئینہ دار ہیں۔

حضرت شمس کی شخصیت کا ایک اہم پہلو تنقید ہے۔ وہ شعر و ادب کے ایسے نقاد ہیں جو فکری اور فنی دونوں پہلوؤں سے شعری اور ادبی تخلیقات کا جائزہ لیتے ہیں اور نہ صرف ان کے محاسن و معائب پر بحث کرتے ہیں بلکہ ان کی اصلاح کر کے معائب کو محاسن سے بدل دینے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ وہ زبان و بیان، عروض و قوافی، تشبیہ و استعارہ، مصطلحات و مفروضات شعرا، صنائع و بدائع، قیاسات و سماعیات، محاورہ، ضرب المثل اور روز مرہ، نیز فصاحت و بلاغت کے معیار، معانی و بیان وغیرہ پر اتنی وسیع اور گہری نظر رکھتے ہیں، جو کم از کم اس دور میں بڑے سے بڑے استاد کو نصیب نہیں۔ شعر فہمی کا ملکہ اور اس کے لفظی و معنوی حسن و قبح کی طرف ذہن کا فوراً ملتفت ہونا بھی ایک خاص صلاحیت ہے۔ جو خلاق فہم و ذکا نے ان کو فیاضی سے ودیعت فرمائی ہے۔ اپنی انہیں صلاحیتوں کے تقاضوں کی بنا پر انہوں نے مشہور شعرا کے کلام کو تنقید کی نظر میں تولد، فکر و فن کی کسوٹی

اور ادیب بھی، اہل زبان بھی ہیں اور ماہر لسانیات بھی، مورخ بھی ہیں اور محقق بھی، معلم بھی ہیں اور نقاد بھی۔ ان کی شخصیت کا ہر پہلو ان کی تصانیف سے نمایاں ہے۔ ہر چند کہ انہوں نے شاعری کو مستقل مشغلہ کے طور پر نہیں اپنایا، مگر انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ فن کے اعتبار سے بہت مضبوط کلام ہے۔ ان کے بعض اشعار ان کی کتاب ’’نگارشات رنگ رنگ‘‘ کے مقدمہ میں شامل ہیں۔ بطور ادیب ان کی تحریریں انشا پر دازی کا اعلان نمونہ پیش کرتی ہیں، جن میں سلاست بھی ہے اور سادگی بھی، لطفِ زبان بھی ہے اور حسن بیان بھی۔ ان کی تحریر حشو و زوائد سے پاک ہوتی ہے۔ ہر جملہ موضوع سے متعلق اور ہر بات اپنی جگہ اٹل۔ ایک بہت اہم بات یہ ہے کہ وہ جو کچھ بھی لکھتے ہیں اس میں کوئی نئی بات ضرور ہوتی ہے۔ کسی موضوع پر دوسروں کی کہی ہوئی باتوں کو دہرا کر اپنی تصانیف میں اضافہ کرنا ان کے مشرب میں حرام ہے۔ وہ تاریخ لکھتے ہیں تو تحقیق و جستجو سے نئے گوشے ابھارتے ہیں اور نئے پہلو سامنے لاتے ہیں۔ مذہب کے حوالہ سے ان کی کتاب ’’اسلام پر کیا گزری‘‘ اور ادبی اعتبار سے ’’تاریخ لکھنؤ‘‘ ان کی تاریخ نویسی کے اس پہلو کی بڑی روشن مثالیں ہیں۔ اسی طرح جب انہوں نے لسانیات پر قلم اٹھایا تو تمام مروجہ نظریات کے برخلاف ایک جدید اور قابل فہم نظریہ پیش کرتے ہوئے ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی جن سے لسانیات کے علم میں اضافہ اور ترقی ہوئی۔ یہ رائے اپنے وقت کے بہت اہم صاحب علم اور نقاد ڈاکٹر احسن فاروقی نے لسانیات پران کا مضمون دیکھنے کے بعد قائم کی تھی۔ جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے، اس وقت اس پران سے بڑی سداور کوئی نہیں۔ خصوصیت کے ساتھ ’’لکھنؤ کی زبان‘‘ کے حوالے سے

پر پرکھا اور جہاں جہاں فکری اور فنی خامیاں نظر آئیں وہاں اصلاح دے کر شعر کو درست بلکہ بلند کر دیا۔ اس باب میں وہ کسی شاعر کی عظمت اور مرتبے سے مرعوب نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ خواہ کتنا ہی بڑا شاعر کیوں نہ ہو اس کا کلام، کلام الہی نہیں، جو ہر عیب سے پاک ہو۔ پھر یہ کہ جو جتنا بڑا شاعر ہو اس پر گرفت بھی اتنی سخت ہونا چاہئے۔ کسی مبتدی یا نوکھئے پر کیا تنقید کرنا، چنانچہ انہوں نے سودا اور انیس ددیر جیسے عظیم شعرا پر بھی تنقید کی اور ان کے کلام پر اصلاح دی ہے۔ ان کی کتاب ”شعور و شاعری“ کا یہی موضوع ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض اہل علم اور اہل قلم نے اس بات کو پسند نہیں کیا۔ مگر اس کی کوئی وجہ بھی نہیں بتائی۔ بس یہ کہا کہ باتیں تو سب ہی ٹھیک لکھی ہیں، مگر یہ نہیں لکھنا چاہئے تھیں۔ غالباً وہ حضرات اس تنقید کو اتنے عظیم شاعروں کے مرتبہ کے خلاف سمجھتے ہوں گے۔ بادی النظر میں یہ بات ٹھیک بھی معلوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقتاً درست نہیں ہے۔ اول تو یہ کہ شمس صاحب وہ نقاد ہیں جنہوں نے خود اپنے کلام پر بھی تنقید کی اور اس کو ہر طرح سے جانچنے اور پرکھنے کے بعد خود اپنے خلاف یہ فیصلہ دیا کہ فرسودہ مضامین کو سیدھے سادے طریقہ سے نظم کرتے ہیں، جن میں کوئی تازگی نہیں، کوئی انفرادیت نہیں اور یہ شاعری ادب میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتی، لہذا اپنے کو شاعر سمجھنا خود کو دھوکا دینا ہے اور شعر کہنا وقت کو ضائع کرنا ہے۔ ان کی خود اپنے کلام پر یہ تنقید خود احتسابی کی ایک منفرد مثال ہے۔ اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ جو نقاد خود اپنے کلام پر اتنی سختی اور اتنی سچائی سے تنقید کر سکتا ہے، اس کو دوسروں کے کلام پر تنقید کرنے کا حق بھی حاصل ہے۔ دوم یہ کہ نقاد کا کام ہی یہی ہوتا ہے کہ لوگوں کے کلام کا جائزہ لے اور دیانتداری

کے ساتھ، جی ہاں! دیانتداری کے ساتھ (جو اولین شرط ہے) اس کے کلام پر تنقید کرے۔ چنانچہ کون ایسا بڑا شاعر گذرا ہے جس کے کلام پر تنقید نہ کی گئی ہو؟ خدائے سخن میر انیس کے کلام پر عبدالغفور نساج کے اعتراضات اور دبیر جیسے عظیم شاعر کے کلام پر ”موازنہ انیس ددیر“ میں شبلی کی تنقید، یہ سب تاریخ ادب کا حصہ ہیں۔ اساتذہ کے کلام کو تنقید کی کسوٹی پر کسنا اور اس پر اصلاح دینا یہ کوئی آج کی بات نہیں۔ عبدالقادر بدایونی نے ہندوستان کی جو سیاسی تاریخ لکھی ہے اس میں امیر خسرو کے ایک بیٹے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ اساتذہ کے کلام پر اصلاح دیتا تھا اور بہت عمدہ اصلاح دیتا تھا۔ اس کی اس خاص صلاحیت اور اس فن میں اس کی مہارت کی بہت تعریف کی جاتی تھی۔ بعد کے زمانہ میں اس موضوع پر سب سے پہلے نیاز فتح پوری کی کتاب ”مالہ دماغلیہ“ کے نام سے آئی، جس میں انہوں نے بعض شعرا کے کلام پر تنقید اور اصلاح کی ہے۔ دوسری کتاب حضرت شمس کی ”شعور و شاعری“ ہے۔ یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ دنیا کی ہر زبان کے تنقید نگاروں نے اپنے اداءء شعرا کے کلام پر تنقید تو کی ہے مگر یا تو اصلاح نہیں دی یا تنقید کو اصلاح کے ساتھ کتابی شکل میں شائع نہیں کیا۔ یہ اردو ہی کا طرہ امتیاز ہے اور اس کا سہرا حضرت نیاز فتح پوری اور حضرت شمس لکھنوی کے سر ہے۔ عہد موجود میں لفظی اور فنی تنقید ختم ہو چکی ہے اور نقاد حضرات صرف فکری پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ فن ختم ہو گیا اور شاعری میں اس قدر بے راہ ردی آ گئی ہے کہ بڑے بڑے شعرا کا کلام فنی اغلاط سے پر ہوتا ہے۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بیشتر شعرا حضرات اب اس فن کی ابجد سے بھی واقف نہیں۔ صنائع لفظی و معنوی، علم بیان

جو بڑے بڑوں کو چونکا دے ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ انہوں نے محض اس رائے کا اظہار ہی نہیں کیا ہے بلکہ اس کو اس شعر اور دوسرے اشعار کا تجزیہ کر کے صحیح بھی ثابت کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ”یہ رائے میں نے اس لئے قائم کی تھی کہ شکوے کرنے اور سننے کے لئے دونوں کا یکجا ہونا ضروری ہے اور دن رات یکجا رہنے والا معشوق نہیں، ہمزاد ہے۔“

اس کے بعد شعر پر اصلاح دیتے ہوئے صرف ایک لفظ بدل کر اس کا عیب یوں دور کر دیا۔

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے نالے
کفن سرکاؤ، میری بے زبانی دیکھتے جاؤ
”شکوے“ کی جگہ ”نالے“ نے دن رات کی یکجائی
کی ضرورت ختم کر دی، اس لئے کہ نالے دور سے بھی سنے
جاسکتے ہیں۔ ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیں:-

ستم رسیدہ آوازہ بیاباں ہوں
قفس میں کھینچ کے لائی مری زباں، صیاد!
گرفتار قفس بلبل صیاد سے کہہ رہی ہے کہ اس نے اس
کی خوش الحانی کی وجہ سے اس کو گرفتار کیا۔ یہ بات اپنے دل
یا ہم قفس سے کہنے کی ہے۔ صیاد تو جانتا ہی ہے۔ یہ عیب
ردیف سے پیدا ہوا۔ شعریوں ہونا چاہئے تھا:-

ستم رسیدہ آوازہ بیاباں ہوں
قفس میں کھینچ کے لائی مری زباں مجھ کو
مگر اس سے بھی شعر درست نہیں ہوا۔ پہلے مصرع میں
خوش الحانی کو ”آوازہ“ اور دوسرے مصرع میں ”زباں“ کہا ہے۔
”آوازہ“ اور ”زباں“ تمام جانوروں میں مشترک
ہے۔ گدھا اور کوا بھی یہی کہہ سکتا ہے۔ یہ کلام کا بڑا نقص ہے کہ
کسی مخصوص صفت کمال کو اس طرح بیان کیا جائے کہ اس میں

عیوب قافیہ وغیرہ کے علم میں بالکل کورے ہیں۔ بس طبیعت
میں ذرا سی موزونیت پائی اور شعر کہنا شروع کر دئے۔ اس
طرح شاعری باز بچہ اطفال بن گئی۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی
ہے کہ بعض جراند میں قطعہ کو رباعی اور رباعی کو قطعہ کہہ کے
شائع کیا جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ شاعری ایک باقاعدہ فن
ہے۔ ہر فن کا یہ اصول ہے کہ پہلے اسے سیکھا جائے پھر اس کے
میدان میں قدم رکھا جائے۔ تیرنا سیکھے بغیر دریا میں چھلانگ
لگا دینے کا نتیجہ ظاہر ہے۔ پہلے زمانہ میں ایک طرف تو شعر گوئی
کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی جاتی تھی۔ دوسری طرف اہل
نظر اور اہل کمال فن تنقید سے غلطیوں کی گرفت کرتے تھے اور
ان کی اصلاح کرتے تھے۔ اس طرح شاعری میں بے راہ
روی کو بھی روکا جاتا تھا اور فن کا تحفظ بھی کیا جاتا تھا۔ یہ فن کی
بڑی اہم خدمت تھی۔ حضرت شمس نے اپنی تنقید کے ذریعہ یہی
خدمت انجام دی ہے اور وہ اس کے لئے ان تمام اہل علم و اہل
نظر کے شکریہ کے مستحق ہیں جن کو فن کی قدریں عزیز ہیں۔
”شعور و شاعری“ کے مضامین کا بغور مطالعہ کیجئے تو پتا چلے گا کہ
شمس صاحب کی نظر کتنی دقیق، شعر فہمی کا ملکہ کتنا عمیق، معانی
و بیان پر کس قدر دسترس، معائب و محاسن شعر یہ پر کتنی گہری
نظر اور فن پر ان کی گرفت کس قدر مضبوط ہے۔ مثلاً کلام فانی
کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے اس شعر سے ابتدا کی ہے:-

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ، میری بے زبانی دیکھتے جاؤ
شعر کے متعلق اظہار رائے کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:-
فانی کا یہ شعر سن کر یہ رائے قائم کی تھی کہ آدمی
طبیعت دار ہیں مگر ذوق سلیم اور شعور صحیح کی کمی ہے۔

فانی جیسے شاعر کے لئے اس قسم کی رائے کا اظہار کرنا

ہوئے شمس صاحب نے اس صنف سخن کی نزاکتوں پر روشنی ڈالی ہے اور نعت گوئی کا ایک معیار معین کیا ہے۔ نعت گوئی کے ایک بنیادی نکتہ کی وضاحت فرماتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:-

دوسرے اصناف سخن میں صرف حسن طبیعت کی ضرورت ہوتی ہے، مگر نعت و منقبت میں حسن عقیدت بھی شامل ہوتا ہے اور ایک ساتھ دونوں کا نباہنا بہت مشکل ہے۔ زبان عشق اور زبان عقیدت میں بڑا نازک فرق ہے اور ان دونوں کا امتزاج بہت دشوار ہے۔

یقیناً شمس صاحب کا بیان کردہ یہ نکتہ بتاتا ہے کہ نعت و منقبت کہنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ اس عہد میں بیشتر نعت گو شعرا اس حقیقت سے بے خبر ہیں اور اسی وجہ سے بعض نعتوں میں ایسے ایسے اشعار سننے میں آتے ہیں جو حفظ مراتب کے خلاف اور معرفت رسولؐ سے بے خبری کی دلیل ہوتے ہیں۔ ان سے سرکار رسالتؐ کی مدح کے بجائے منقصت کے پہلو نکلتے ہیں۔ ماہر القادری صاحب کے مجموعہ نعت ”ذکر جمیل“ کی پہلی ہی نعت پر جو انہوں نے تنقید کی ہے، اس میں معنوی خامیوں کے ساتھ ساتھ زبان و عروض کی غلطیوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔ شاعری کے اعتبار سے بھی ان کے کلام کو غیر مستحسن ثابت کیا ہے۔ سودا کا ایک شعر جس پر تنقید ”شعور و شاعری“ میں شامل نہیں ہے۔ ملاحظہ کیجئے:-

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا!
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

سودا کا یہ شعر بہت مشہور ہے اور دوسرا مصرع تو زبان زد ہے۔ اس پر غور کرنے سے وہ دو عیب بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتے ہیں جن کی نشاندہی شمس صاحب نے کی ہے اور

تعمیم پیدا ہو کے اس کی اہمیت ختم ہو جائے۔ یہ صحیح ہے کہ بلبل کے ساتھ ”آواز“ کا ذکر خوش الحانی اور گدھے کے ساتھ کراہت صوت کا قرینہ ہے۔ مگر اس شعر میں یہ قرینہ بھی نہیں۔ صرف ”آوازہ بیاباں“ سے اگر آپ بلبل سمجھیں تو یہ آپ کا حسن ظن ہوگا کہ شاعر یہی کہنا چاہتا ہے۔ الفاظ سے یہ معنی پیدا نہیں ہوتے۔ بلبل بیاباں میں نہیں، باغ میں شاخ گل پر خوشبو سے مست ہو کر چہکتا ہے۔ بیاباں میں آلو بولتا ہے۔ قرینہ اس مطلب پر دلالت کرتا ہے کہ صیاد سے آلو کہہ رہا ہے کہ اس نے اس کے بولنے سے اس کو پہچان لیا اور گرفتار کر لیا اور اس کے لئے ”آوازہ“ ہی کہنا مناسب تھا۔ الفاظ اور قرینہ سب اسی پر دلالت کرتے ہیں کہ ”آلو“ سمجھا جائے۔ مگر یہ شاعر کے کہنے کی بات نہیں، اس نے یقیناً ”بلبل“ کہنا چاہا ہے۔ یہ زبان و بیان کا بڑا نقص ہے کہ کہنا چاہا ”بلبل“ اور کہہ گیا ”آلو“۔ اگر ”آوازہ بیاباں“ کی جگہ ”آوازہ گلستاں“ ہوتا تو یہ نقص پیدا نہ ہوتا۔ مگر شاعر جو کہنا چاہتا ہے وہ اس سے بھی ادا نہیں ہوتا۔ بلبل کا اپنی نواسنجی کو ”آوازہ“ کہنا منشاء بلاغت کے خلاف ہے۔

اس کو یوں کہنا چاہئے:-

ستم رسیدہ اعجاز نغمہ سنجی ہوں
قفص میں کھینچ کے لائی مری زباں، صیاد!

مگر اس میں بھی ”صیاد“ اور ”زباں“ کی لفظ باقی رہتی ہے۔ اگر ردیف و قافیہ کا لحاظ نہ کیا جائے تو اس مفہوم کو یوں ادا ہونا چاہئے:-

ستم رسیدہ اعجاز نغمہ سنجی ہوں
قفص میں کھینچ کے لایا مرا کمال مجھے!

ماہر القادری صاحب کی نعت گوئی پر تبصرہ کرتے

جن کی وجہ سے شعر نے اپنی معنویت اور اپنا حسن کھو دیا ہے۔ ایک تو ”کیفیتِ چشم“ کی لفظ جس سے کسی طرح بھی محبوب کی آنکھوں کا حسن، ان کی کشش، گلابی شرابی رنگت اور خمار آلود مستی ظاہر نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف میر کا شعر ہے۔

میر! ان نیم باز آنکھوں میں

ساری مستی شراب کی سی ہے

جس نے محبوب کی آنکھوں کے حسن کی تصویر کھینچ دی ہے اور اس طرح کے شعر پڑھ یا سُن کے تصور ان آنکھوں کے حسن میں کھوجاتا ہے اور دل بے اختیار ان کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ شمس صاحب نے ”کیفیتِ چشم“ کی بے کیف اور بے لطف ترکیب کو بدل کر اور اس کے بجائے ”وہ مست نگاہیں“ کہہ کر اس میں وہ کیفیت، لطف اور اثر پیدا کر دیا ہے جس سے قاری محبوب کی حسین آنکھوں کے تصور میں کھوجائے اور اس کے جذب و کشش سے اپنے دل کو اس کی طرف کھینچتا ہوا محسوس کرے۔ دوسرا عیب مصرع میں ”مجھے یاد ہے سو آ“ کے ٹکڑے سے پیدا ہوا ہے۔ یہاں ”یا وہ“ کی لفظ ماضی سے حال تک محیط ہے۔ اس لئے کسی فوری ردِ عمل کا سبب نہیں ہو سکتی۔ اگر اس کے بجائے یہ کہا جاتا کہ ”ساغر شراب ویکھ کر وہ آنکھیں اور ان کی مستی مجھے یاد آگئی“ تو اس کا فوری اور فطری ردِ عمل یہ ہوتا:-

وہ مست نگاہیں مجھے یاد آگئیں سو آ!

اس اصلاح نے شعر کو معنوی اعتبار سے بھی بلند کر دیا

اور اس میں لطف بھی پیدا کرویا۔

اس طرح انیس ودبیر جیسے شاعرانِ اعظم کے کلام پر بھی انہوں نے جو تنقید کی ہے اور جو اصلاحیں دی ہیں وہ ”طلوع افکار“ کے مارچ ۱۹۹۵ء کے شمارہ میں ”انیس ودبیر کے

غلط اشعار“ کے عنوان سے شائع ہوئی ہیں۔

میر انیس اور مرزا ودبیر ایسے عظیم شاعر ہیں جن کا کوئی مثل نہیں۔ ان کے شاعرانہ کمال سے انکار اپنی ناہنجی کا اقرار ہے۔

ہر شاعر کے کلام میں اچھے برے ہر طرح کے شعر ہوتے ہیں، مگر اس کی شاعری کا درجہ اس کے اچھے اشعار سے متعین کیا جاتا ہے۔ میر ”خدائے سخن“ کہے جاتے ہیں۔ ان کے پست اشعار سے ان کا درجہ متعین نہیں کیا جاتا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مضمون آفرینی میں زور طبیعت سے الفاظ کی طرف خاص توجہ نہیں ہوتی اور صحیح طور پر مفہوم ادا نہیں ہوتا، مگر شاعر کے ذہن میں موجود ہوتا ہے، اس وجہ سے وہ سمجھتا ہے کہ مطلب ادا ہو گیا۔ اسی کو ”المعنی فی بطن الشاعر“ کہتے ہیں۔ روانی طبیعت میں بھی تلاش و بندش الفاظ میں کوتاہی ہو جاتی ہے، یہ ہر شاعر سے ہوتا ہے۔ انیس ودبیر کے یہاں بھی غلطیاں ہیں۔ ان کا بیان اصلاح ذوق کے لئے مفید ہے۔ اس لئے میر صاحب اور مرزا صاحب کے کلام سے اس کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں:-

پیدا شعاع مہر کی مقراض جب ہوئی

پہناں ورازی پر طاؤس شب ہوئی

مجنوں صفت قبائے سحر چاک سب ہوئی

اور قطع زلف لیلیٰ زہرہ لقب ہوئی

فکر رفوتھی چرخ ہنر مند کے لئے

دن چار ٹکڑے ہو گیا پیوند کے لئے

پہلے مصرع میں ”مقراض“ ہے، دوسرے میں ”قطع“،

ہونا چاہئے۔ ورنہ ”مقراض“ کہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ دوسرے

مصرع میں ”طاؤس شب“ اضافتِ تشبیہی ہے اور وجہ شبہ کوئی

نہیں، اس وجہ سے تشبیہ بالکل باطل ہو گئی۔ چوتھے مصرع میں

”لیلیٰ زہرہ لقب“ بے معنی ہے۔ یعنی جو لیلیٰ زہرہ لقب تھی اس کی زلف قطع ہو گئی۔ لیلیٰ کو زہرہ لقب کہنا صحیح نہیں۔

۔ برعکس نہند نام زنگی کا فور

اگر یہ ہوتا کہ ”لیلیٰ زہرہ لقب“ ہو گئی تو صحیح ہوتا۔ لیکن لیلیٰ جو زہرہ لقب تھی اس کی زلف قطع ہو گئی۔ اس کا مطلب ہے کہ روشنی جاتی رہی تاریکی آگئی، جو مراد شاعر کے خلاف ہے۔ ”لیلیٰ زہرہ لقب ہو گئی“ کہنا چاہئے تھا۔ مگر اضافت کی وجہ سے یہ مفہوم پیدا نہیں ہو سکتا اور اضافت کے بغیر مصرع موزوں نہیں ہوگا۔ پانچویں مصرع میں ”فکر فو“ یعنی ”قبائے سحر چاک“ ہونے سے جو نور پھیلا تھا، قبائے سحر میں رفو کر کے تاریکی واپس لانے کی فکر ہوئی۔ یہ منشاء شاعر کے خلاف ہے۔ ”چرخ ہنرمند“ بھی غلط ہے۔ ہنرمند صرف عقل و شعور رکھنے والا ذہین کار پرداز انسان ہو سکتا ہے۔ زمین، آسمان، جنگل، بیابان تمام حیوان ہنرمند ہو سکتے ہیں۔ اگر ایسی صفت کسی میں ظاہر کرنا ہوتی ہے، جو اس میں نہیں پائی جاتی ہے، تو شاعر اس کے لئے دلیل شاعرانہ پیش کرتا ہے، جیسے آگ سے شعلہ اور دھواں نکلتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ آگ سے پانی نکلا اور اس کو یوں ثابت کرتا ہے:-

دل سے لوکا جو اٹھا، آنکھ سے ٹپکا پانی

آگ سے آج نکلتے ہوئے دیکھا پانی

کسی شاعر نے کہا ہے کہ پانی کی تہہ میں آگ جل رہی ہے اور ساحل سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ اس کو یوں ثابت کیا ہے:-

لبوں پر آہ، بحر عشق میں ڈوبا ہوا دل ہے

تہہ آب آگ جلتی ہے، دھواں بالائے ساحل ہے

چھٹے مصرع میں پیوند کا سامان ہو گیا۔ جہاں رفو کی

ضرورت ہے وہاں پیوند نہیں لگتا پورا بند

۔ پُر ہے غلاط سے یوں، راگ سے جیسے باجا

اصلاح سے یوں درست ہو سکتا ہے:-

پیدا شعاع مہر کی مقراض جب ہوئی

تب قطع زلف لیلیٰ مسکین شب ہوئی

مجنوں صفت قبائے سحر چاک سب ہوئی

لیلیٰ لقب جو شب تھی، وہ زہرہ لقب ہوئی

زنگی شب کی تیرگی کا فور ہو گئی

گیتی تمام نور سے معمور ہو گئی

میر صاحب نے مرزا صاحب کے جواب میں جو مرثیہ

کہا، اس کی ایک بیت سنئے:-

بھڑکی تھی آگ گنبد چرخ اشیر میں

بادل چھپے تھے سب کرۂ زمہریر میں

اب تو نظام فیثا غورث نے یہ ثابت کر دیا کہ آسمان کا

وجود ہی نہیں ہے۔ لیکن جب میر صاحب نے کہا تھا، اس وقت

نظام بطلموسی صحیح سمجھا جاتا تھا، جس میں کرۂ زمین پر کرۂ ہوا، اس

پر کرۂ زمہریر، اس پر کرۂ نار اس پر آسمان ہے۔

میر صاحب فرماتے ہیں کہ زمین پر اتنی گرمی تھی کہ کرۂ

نار میں آگ بھڑکنے لگی، اس میں آگ بھڑکتی ہے، زمین کی

گرمی سے اس کا کیا تعلق، اگر کہا جائے کہ زمین کی گرمی نے

اس کے شعلوں کو تیز کر دیا۔ جو مصرعہ سے ظاہر نہیں ہوتا، لیکن یہ

فرض کرنے کے بعد بھی مضمون غلط ہے۔ یعنی زمین کی گرمی کرۂ

ہوا سے گذرتی ہوئی کرۂ زمہریر کو پار کرتی کرۂ نار میں پہنچ گئی

اور وہاں شعلے بھڑکا دئے، نہ کرۂ زمہریر نے اس کو متاثر کیا نہ

اس نے کرۂ زمہریر کو۔ یہ سب بے ربط باتیں ہیں۔ اس کو یوں

درست کیا جاسکتا ہے:-

خلاف اور بھونڈی بات ہے۔ بیت یوں درست ہو سکتی ہے:-
 پیاسی جو تھی سپاہ شہ کائنات کی
 ساحل سے سرچلتی تھیں موجیں فرات کی
 ”شہ کائنات“ کہنے سے موجوں کے سر پٹکنے میں
 بلاغت پیدا ہو گئی ہے ۔

صلائے عام ہے یار ان نکتہ داں کے لئے
 اشعار کے حسن و قبح پر حضرت شمس صاحب کی یہ
 بحثیں، غلطیوں کی نشاندہی اور ان پر اصلاحیں اگر بغور دیکھی
 جائیں تو شعر غمی، ژرف نگاہی، تنقید کے فن میں ان کی
 مہارت، معانی و بیان پر ان کی نظر کی گہرائی و گیرائی اور اصلاح
 دینے کے فن میں ان کے کمال کا اندازہ ہوگا۔ ”شعور و شاعری“
 ان کے انہیں فنی کمالات کی آئینہ دار ہے۔

زندگی

طب کا امتحان پاس کرنے کے بعد علاج معالجہ کا
 سلسلہ اس وقت سے اب تک قائم ہے، مگر مطب عام نہیں۔
 اپنی گونا گوں مصروفیات کی وجہ سے انہوں نے اس کو اپنا پیشہ
 نہیں بنایا، مگر مخصوص لوگوں کا علاج اب بھی کرتے ہیں اور طبی
 مشورے بھی دیتے ہیں۔

شکار: مولانا کو ۱۹۴۰ء میں شکار کا شوق ہوا۔ اس
 میں بھی انہوں نے حیرت انگیز کمال حاصل کیا۔ وہ بارہ بور کی
 بندوق اور آٹھ نمبر کے چھرے سے اڑتے ہوئے پرندہ کو گرا
 دیتے تھے۔

اسنیک شوٹنگ: ہندوستان میں ایک پرندہ، قد میں
 چڑیا کا دونوں دم بہت لمبی، بنجر زمین پر بیٹھا دم ہلاتا رہتا ہے۔
 اس کا نام چرندھول ہے اور چنڈول کے نام سے مشہور ہے۔
 آدمی کی آہٹ پاتے ہی اڑتا ہے۔ اس کی پرواز سیدھی
 نہیں ہوتی بلکہ اوپر نیچے ہوتا ہوا اڑتا ہے۔ اس کا شکار بہت

گرمی ہوا میں ایسی تھی، جیسی اشیر میں
 بادل چھپے تھے سب کرہ زمہریر میں
 ایک اور بیت ہے:
 پانی تھا آگ، گرمی روز حساب تھی
 ماہی، جو سیخ موج تک آئی، کباب تھی
 جب پانی آگ تھا تو مچھلی کو وہیں کباب ہو جانا چاہئے
 تھا۔ سیخ موج تک زندہ پہنچنا کیسے ممکن ہے؟ مرزا صاحب نے
 صحیح کہا ہے:-

ہوتی تھیں سیخ موج پہ مرغابیاں کباب
 بیت یوں صحیح ہو سکتی ہے:
 پانی تھا آگ، گرمی روز حساب تھی
 ماہی جہاں تھی، بحر کے اندر کباب تھی
 ایک بیت یہ بھی ہے:

پیاسی جو تھی سپاہ خداتین رات کی
 ساحل سے سرچلتی تھیں موجیں فرات کی
 ”تین رات کی پیاسی“ روز مرہ اور اصولِ تکلم کے
 خلاف ہے۔ ”رات“ سے وہی باتیں منسوب کی جاتی ہیں، جو
 اس سے مخصوص ہیں۔ جیسے چاندنی رات، تاروں بھری رات،
 برسات کی رات، بیاہ کی رات یا کوئی مخصوص واقعہ کسی رات
 میں ہوا ہو، اس کو کہا جاتا ہے۔ باقی ہر بات دن سے منسوب کی
 جاتی ہے۔ جس میں رات شامل ہوتی ہے۔ ”دن“، ”رات“
 کے مقابلہ میں کامل ہے۔ اس کو چھوڑ کے ناقص کا ذکر اصولِ تکلم
 کے خلاف ہے۔ جو بات ”رات“ سے مخصوص نہیں ہے بطور
 واقعہ بیان کیا جا رہا ہے تو اس میں دن شامل نہیں ہوتا۔ جیسے تین
 رات، محفلِ رقص و سرور گرم رہی۔ اس میں دن شامل نہیں ہے۔
 وہ تین دن میرے مہمان رہے تو اس میں رات شامل ہے۔
 ”تین رات کی پیاسی“ محاوروں اور اصولِ تکلم، دونوں کے

مشکل ہے، مگر مولانا اس کو گرا لیتے تھے۔ ایک دفعہ کنور صاحب سنگرامنؤ کے ساتھ شکار پر گئے۔ سامنے ہرن نظر آیا۔ مولانا نے کہا:

”میں کچھ پڑھ کر اس پر گولی چلاؤں گا۔ گولی اس پر سے گذر جائے گی اور یہ گر جائے گا۔“ انھوں نے رائفل دے دی۔ مولانا نے نشانہ باندھ کر گولی چلائی، ہرن گر گیا۔ ان کے آدمیوں سے کہا:

”اسے ہاتھ پیر باندھ کر لے آؤ۔ تھوڑی دیر میں یہ اٹھنے کی کوشش کرے گا۔“ ہرن لایا گیا۔ دیکھا کہ گولی کا کہیں نشان نہ تھا۔ کنور صاحب نے کہا:

”آپ نے جو پڑھ کر گولی چلائی، مجھے بھی بتائیے۔“ کہا: ”میں نے بسم اللہ کہہ کے اس کے سینک کی نوک پر گولی ماری۔ اس سے اس کا بھیجاہل گیا اور یہ بیہوش ہو کر گر پڑا۔“ اس نشانہ سے لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی مگر اس فن میں بھی وہ ہندوستان گیر شہرت حاصل نہ کر سکے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس شغل کی عمر صرف نو سال ہے اور وہ بھی ایسے دیہات میں، جو تین شہروں کی سرحد پر واقع ہے، یعنی جو پور، سلطانپور اور پرتاب گڑھ۔ ہر شہر وہاں سے تیس چالیس میل دور ہے۔

ادبی زندگی کا آغاز

مولانا کی ادبی زندگی کا آغاز سترہ برس کے سن سے ہوا، جب وہ ریاضی جنٹری میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ اس کے بعد رسالہ ”حقائق“ میں مضمون لکھنا شروع کیا، مگر اس کی اشاعت محدود تھی، لیکن جن لوگوں تک وہ رسالہ پہنچتا تھا، وہ صاحبان علم تھے اور انہوں نے ان کے مضامین کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور ہمت افزائی بھی کی۔ ۱۹۳۴ء میں انھوں نے علی عباس حسینی کے افسانہ ”باسی پھول“ پر سخن ہائے ناگفتی کے عنوان سے تنقید کی، جو اخبار ”سرفراز“ میں مسلسل چھپتی رہی۔ اس سے ان کو عام شہرت ہوئی۔ اس کے بعد

۱۹۳۶ء میں علی ضامن ترمذی نے لکھنؤ کی شاعری اور وہاں کے شعرا پر ”حقیقتِ حال“ کے عنوان سے جارحانہ حملے کئے۔ اس کا جواب مولانا نے ”حقیقتِ حال کا جائزہ“ کے عنوان سے اخبار ”سرفراز“ میں لکھا، جس کا سلسلہ مہینوں جاری رہا۔ اس مضمون کو بے حد پسند کیا گیا اور ہر طرف سے اس کی تعریف میں لوگوں نے قلم فرسائیاں کیں۔ نیاز فتحپوری نے اس کا خلاصہ ”نگار“ میں اس نوٹ کے ساتھ شائع کیا:

”اس کا جواب محال ہے، لیکن کوئی صاحب لکھنا چاہیں تو ”نگار“ کے صفحات حاضر ہیں۔

”پروفیسر مسعود حسن ادیب نے مولانا کو لکھا:

”آپ کا جو مضمون ”نگار“ میں شائع ہوا ہے، وہ میں اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔ کن نمبروں میں شائع ہوا ہے؟“ (ان کا یہ خط میں نے ”نگارشات رنگ رنگ“ میں چھاپ دیا ہے)۔ جعفر علی خاں اتر نے مولانا کو لکھا:

”آپ کے مضامین میں بڑی دلچسپی سے پڑھتا رہا ہوں۔ آپ نے معترضین کو دندان شکن جواب دیئے ہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ آپ کی یہ کتاب اسقام و اغلاط سے پاک ہے۔ یہ اور اس کے علاوہ بہت سے خطوط میں نے ”نگارشات رنگ رنگ“ میں شائع کر دیئے ہیں۔ ۱۹۴۰ء تک مولانا کو بڑی شہرت حاصل ہوئی اور بقول ڈاکٹر نعیم نقوی، ”بڑے بڑوں نے ان کا لوہا مان لیا۔“

پاکستان آمد

۱۹۴۷ء میں انگریزوں نے ہندوستان کو آزاد کیا۔ اسمبلیوں کا انتخاب ہوا۔ سم پور نانند بنارس کے ایک ہائی اسکول ٹیچر صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں کامیاب ہو کر وزیر تعلیم ہو گئے۔ انہوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اسکولوں سے اردو اور فارسی خارج کر دی۔ مولانا معطل ہو گئے اور جون ۱۹۴۹ء میں پاکستان آ گئے۔

کے کلام کی فنی غلطیاں دکھا کر ان کی اصلاح کی گئی۔ یہ تمام مضامین جمع کر کے مولانا نے اس پر ایک مقدمہ لکھا اور ”شعور و شاعری“ کے نام سے شائع کر دیا۔

مولانا کی تصانیف

مولانا کی بعض تصانیف حسب ذیل ہیں:

(۱) در منظوم: یہ کتاب لکھنؤ کے معروف شاعر اور عالم، وجاہت حسین ناظم کے قصائد، ان کے حالات اور ان کے کلام پر مفصل تبصرہ پر مشتمل ہے۔ ۱۹۳۷ء میں یہ کتاب لکھنؤ سے شائع ہوئی۔

(۲) شکستِ آئینہ: پروفیسر مسعود حسن ادیب کی کتاب ”ہماری شاعری“ پر بیخود موبانی کے اعتراضات، جو ”آئینہ تحقیق“ کے نام سے شائع ہوئے تھے، کا جواب مولانا نے اس کتاب کے ذریعہ دیا۔ اس میں لفظ و معنی کے تعلق پر ایک دقیق بحث ہے۔ یہ کتاب ۱۹۲۸ء میں نظامی پریس، لکھنؤ سے چھپی۔

(۳) فلسفہ خیام: اس میں خیام کی فکر اور اس کے فلسفہ پر اس کی رباعیات کے حوالہ سے گفتگو ہے۔ یہ کتاب بارہ، تیرہ برس تک لکھنؤ یونیورسٹی کے بی۔ اے۔ اور دبیر کامل کے نصاب میں شامل رہی۔ یہ ۱۹۳۷ء میں سرفراز پریس، لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔

(۴) لکھنؤ کی زبان: ۱۹۳۷ء میں یہ کتاب لکھی گئی اور ۱۹۵۵ء میں کراچی سے شائع ہوئی اس میں دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا فرق، لکھنؤ کی زبان کے امتیازی خصوصیات اور زبان کے لئے لکھنؤ کے شعراء وادباء کی خدمات کا جائزہ شامل ہے۔

(۵) لکھنؤ کی تہذیب: یہ لکھنؤ کی تمدنی، علمی اور ادبی تہذیب کا تفصیلی جائزہ ہے۔

پاکستان آنے کے بعد: ۱۹۵۲ء میں یہاں اردو، فارسی پڑھانے پر گورنمنٹ اسکول میں ملازم ہو گئے۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۵۲ء تک ادبی مشاغل ترک رہے۔ ۱۹۵۳ء میں ان کی کتاب ”لکھنؤ کی زبان“ شائع ہوئی۔ وہ اخباروں کو بھیجی گئی۔ ہندوستان و پاکستان کے اخباروں نے اس پر گرائڈر تبصرے کئے اور ایک دفعہ پھر ان کا نام منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد پھر خاموشی اختیار کر لی، مگر کتب بینی اور لکھنے پڑھنے میں مشغول رہے۔ کئی کتابوں کے خاکے بنائے اور کئی کتابیں لکھیں، مگر شائع کوئی نہیں ہوئی۔ جب نیاز صاحب پاکستان آئے تو مولانا سے ملے اور کہا: ”ایک وقت وہ تھا کہ میں آٹھ آٹھ گھنٹے کام کرتا تھا۔ اگر مضامین ”نگار“ کے معیار کے نہ ہوتے تو پورا پرچہ لکھ ڈالتا۔ اب میں آدھ گھنٹے بھی کام نہیں کر سکتا، لہذا آپ ”نگار“ کے لئے مضامین لکھا کیجئے۔“ چنانچہ مولانا کی مضمون نگاری کا سلسلہ شروع ہو گیا، جو نیاز صاحب کے بعد بھی جاری رہا۔ اس طرح ایک دفعہ پھر مولانا کا نام ہندو پاکستان کے ادبی حلقوں میں گونجنے لگا۔ اسی زمانہ میں عبداللہ کالج کے پرنسپل نے مولانا سے خواہش کی کہ ”عکس لطیف“ کے لئے ایک مضمون لکھنؤ پر لکھ دیں، چنانچہ انہوں نے ”مدینہ تہذیب لکھنؤ“ کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ اس کو بہت پسند کیا گیا اور لوگوں نے اس سلسلہ کو جاری رکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ مدیر ”عکس لطیف“، مکرم لکھنوی صاحب نے بھی مولانا سے اصرار کیا، چنانچہ یہ سلسلہ جاری رہا، یہاں تک ایک کتاب مرتب ہو گئی اور مدیر ”عکس لطیف“ نے ڈاکٹر احسن فاروقی صاحب سے مقدمہ لکھوا کر اسے کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ اس کے بعد ”عکس لطیف“ بند ہو گیا۔ اسی زمانہ میں، میں نے ”طلوع افکار“ جاری کیا اور میری خواہش پر مولانا نے اس میں تنقیدی مضامین لکھنا شروع کئے۔ اس میں مشہور شعرا

(۶) لکھنؤ کی شاعری: لکھنؤ کی شاعری کے امتیازی خصوصیات، دہلی کی شاعری سے اس کا تقابل اور شعرائے لکھنؤ کے منتخب کلام پر مشتمل یہ کتاب ڈاکٹر احسن فاروقی کے تبصرہ کے ساتھ شائع ہوئی۔

(۷) تاریخ لکھنؤ: بلا خوفِ تردید مولانا عبدالحلیم شرر کی ”مشرقی تمدن کا آخری نمونہ“ کے بعد اس موضوع پر دنیائے ادب میں دوسری بڑی تصنیف ہے۔ یہ کتاب پہلے ماہنامہ ”عکس لطیف“ میں بلا قسط چھپی اور ۱۹۷۲ء میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔

(۸) انتخاب دیوانِ جاوید: بندہ کاظم صاحب جاوید کے کلام کا انتخاب، شاعر کے حالات اور مقدمہ کتاب مولانا کے قلم سے۔

(۹) شعور و شاعری: نیاز فتحپوری کی ”مالہ و ماعلیہ“ اور ”انتقادیات“ کے مرتبہ کی یہ تصنیف ہے۔ اندازِ تحریر نہایت عالمانہ اور دلچسپ اور مولانا کی قوتِ نقد کا آئینہ دار ہے۔ مقدمہ ڈاکٹر احسن فاروقی کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں مشاہیر، شعرا کے کلام پر فی غلطیوں کی نشاندہی کے ساتھ اصلاح کی گئی ہے۔

(۱۰) نگارشاتِ رنگ رنگ: اس کتاب میں دس تحقیقی اور تنقیدی مقالات شامل ہیں۔ یہ مضامین ”نگار“، ”عکس لطیف“ اور ”طلوع افکار“ میں چھپ چکے ہیں۔

ان کے علاوہ مولانا کی مذہبی تصانیف میں حسب ذیل کتابیں شامل ہیں:

(۱) ہندوستان میں شیعیت کی تاریخ

(۲) امام ابوحنیفہ کا مذہب

(۳) اسلام پر کیا گزری۔ (اس کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر احسن فاروقی نے True face of Islam کے نام سے کیا ہے۔)

ان کے علاوہ مولانا کی غیر مطبوعہ کتابیں حسب ذیل ہیں:

(۱) تنقیدی مباحث

(۲) حیات تاج العلماء

(۳) تاریخ اسلام

(۴) امام زین العابدینؑ

مولانا نے لسانیات میں ایک نئے علم کی بنیاد رکھی اور مذہبی علوم میں اضافہ کیا۔ انہوں نے شعر و ادب میں نئے قاعدے بھی وضع کئے ہیں۔ یہ وہ کارنامے ہیں، جو ان کی مثال پیش کرنے سے اذہان کو عاجز کر دیتے ہیں۔ ایسے علماء اور ادبا گذرے ہیں جنہوں نے تاریخ اور مذہب پر کتابیں لکھی ہیں، لیکن میری نظر میں کوئی ایسا مصنف نہیں ہے، جس نے بقول ڈاکٹر احسن فاروقی، ”تاریخ میں نئے انکشافات کئے ہوں“۔

اولاد

مولانا کے چار بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہیں بڑے صاحبزادے محمد مرتضیٰ کا انتقال ہو گیا۔ دوسرے بیٹے محمد موسیٰ ایم۔ اے۔ اسسٹنٹ کمشنر انکم ٹیکس ہیں۔ تیسرے محمد تقی ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی۔ جو ڈیشل مجسٹریٹ ہیں۔ چوتھے بیٹے محمد فاخر منیجر دارالتصنیف اور منصرم امور ہیں۔ ان سب سے مولانا کی ستانوے اولادیں ہیں، جن میں بیٹے بیٹیاں، پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں، کنواسے کنواسیاں، داماد اور بہوئیں شامل ہیں۔ خداوند عالم نے علم و اولاد اور شہرت و عظمت سے ان کا دامن بھر دیا ہے۔ عمر بھی طویل عطا کی ہے۔ اس وقت تک دل و دماغ اور حافظہ جوان ہے۔

میں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ اپنے ذاتی علم اور تجربہ سے لکھا ہے۔ بعض حالات ان سے معلوم کئے ہیں۔ شخصیت و فن پر جو کچھ لکھا ہے، وہ بھی میرے ذاتی علم و تجربہ کا نتیجہ ہے۔ (ماخوذ از: کتاب ”مولانا محمد باقر شمس..... شخصیت و فن“ مرتبہ حسین انجم مدیر ”طلوع افکار“ مطبوعہ کراچی پاکستان)